© rasailojaraid.com

ششماہی علوم القرآن علی گڑھ ۹/۱، ۲، جنوری۔ دسمبر ۱۹۹۴ء

نظمِ قرآن اور ارتباطِ حیوی

محمد فاروق خاں

قرآن خدا کا کلام ہے۔ جس طرح خدا کی ذات سب سے فائق اور برتر ہے ٹھیک اسی طرح اس کے کلام کو بھی سارے کلاموں پر برتری حاصل ہے۔ یہ کلام ہر قسم کے عیوب و نقائص سے پاک ہے۔ اس کے محاسن اور اس کی خوبیوں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ ہر شخص اپنے ظرف اور فکر کے مطابق اس سے ہدایت حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن کوئی بھی شخص یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب نہیں ہو سکتا کہ اس نے کلام الٰہی کی تمام باریکیوں اور حکمتوں کو جان لیا اور اس کی تمام تر لذتوں سے اس کے دل نے حظ حاصل کر لیا ہے۔

قرآن کا اعجاز اس کے معارف اور حِکَم ہی پر قائم نہیں ہے بلکہ اپنے ادبی محاسن کے لحاظ سے بھی اسے وہ اعجاز حاصل ہے جو کسی کلام کو میسر نہیں۔ قرآن ایک مربوط و منظم کلام ہے اور اس کے نظم و ترتیبِ بیان میں بھی اس کا اعجاز قائم ہے۔ اس کے نظمِ کلام میں غور و فکر اور تدبر بندے کے لئے ایک بڑی سعادت کی بات ہے۔

قرآن کے منظم و مربوط کلام ہونے سے انکار خود اپنی کوتاہیٔ فکر و فہم اور کم ظرفی کی بات ہوگی۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کا نظمِ کلام عام انسانی کلام کے نظم و ترتیب سے یکسر مختلف ہے۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ قرآن میں نظم و ارتباط کا کوئی نظام نہیں پایا جاتا بلکہ وہ کلام منتشر کا ایک مجموعہ ہے۔ اور اس کی مثال آسمان کے منتشر ستاروں کی ہے جو خواہ کتنے ہی حسین کیوں نہ ہوں لیکن وہ بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان میں نظم و ارتباط کی تلاش بے سود ہے۔

عام طور پر کسی بلیغ و فصیح کلام کے محاسن کو سمجھنے کے لئے فصاحت و بلاغت کے جن عام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسالیب کو جاننے کی ضرورت ہوتی ہے ہم اس کے سلسلہ میں بھی بے اعتنائی سے کام لیتے ہیں۔

کسی فصیح و بلیغ کلام کے نظم و ترتیب کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم بلاغت و فصاحت کے اصول و اسالیب سے واقف ہوں۔ ہم جانتے ہوں کہ کنایہ و استعارہ، تشبیہ و تمثیل، تقدیم و تاخیر، اخفاء و اظہار، تعریض، عمود کلام، حذف و تکرار، لف و نشر مرتب و غیر مرتب، توجیہ و ابہام، التفات، احتباک، ایجاز و اطناب وغیرہ کے اصول و ضوابط کیا ہیں؟ اور ان سے کلام کے محاسن میں کس طرح کا اضافہ ہوتا ہے۔ اور نظمِ قرآن پر ان کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان اسالیب میں سے بطورِ مثال صرف چند ایک کی وضاحت ہم یہاں کرنا چاہیں گے تاکہ یہ اندازہ کرنے میں آسانی ہو کہ نظمِ کلام کے سمجھنے کے لئے اسالیبِ کلام سے واقفیت کس درجہ ضروری ہے۔

عمود

مہذب اور فصیح کلام منتشر افکار و خیالات سے ہرگز مملو نہیں ہوتا۔ لازماً اس کے تمام ہی مباحث کسی مرکزی موضوع Central Idea سے وابستہ ہوں گے اور یہی مرکزی معنی و موضوع کلام کو ایک وحدت کی شکل دے رہا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں نظم کلام کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہماری نظر کلام کے مرکزی موضوع اور عمود سے نہ ہٹے۔ اس کی طرف سے غفلت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نظمِ کلام کا اصل سرا ہمارے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا اور ہم کلام کے محاسن کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔

یہاں مثال میں سورۃ القیامۃ کو لیں۔ اس سورہ کا اصل موضوع انذارِ قیامت ہے۔ اس لئے اس سورہ کے نظم کو سمجھنے کے لئے اس کے اس مرکزی موضوع سے اغماض صحیح نہ ہوگا۔ سورۃ القیامۃ کا آغاز ہی قیامت کے ذکر سے ہوتا ہے۔ اور قیامت ہی کا اثبات اور اس کے احوال اس سورہ میں زیرِ بحث آئے ہیں۔ اس لئے سورہ کی اس خصوصیت کو ذہن میں رکھ کر اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اس سورہ کی آیات: لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۝ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۝ (القیامہ: ۱۶-۱۹) کی تاویل میں کوئی اشکال پیدا نہ ہوتا اگر سورہ کے اصل موضوع کی روشنی میں ان آیتوں پر غور کیا جاتا: لتعجل بِهٖ میں بِهٖ کی ضمیر مجرور یوم القیامہ ہی کی طرف راجع ہے۔ اور جمعہٗ، قرآنہٗ، بیانہٗ کی ضمیر مضاف الیہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نیز قرآنہ کی ضمیر منصوب ماقدم وأخر کی طرف راجع ہے۔ اس کے واضح قرائن موجود ہیں۔ آیات کا مطلب یہ ہوگا کہ اے یہ کہنے والے کہ قیامت کا دن کب ہوگا؟ (یسئل ایان یوم القیامۃ) اس کے لئے زبان نہ ہلا کہ تو اسے جلد حاصل کرلے۔ قیامت اپنے وقت مقررہ پر آکر رہے گی۔ اس کے لئے جلدی مچانا سخت نادانی کی بات ہے۔ تو اسے معمولی دن سمجھ کر اس کا مذاق اڑا رہا ہے حالانکہ وہ نہایت ہی ہولناک دن ہے۔ جس کے تصور ہی سے دل لرز جائیں۔ (فاذا برق البصر ہ وخسف القمر ہ وجمع الشمس والقمر ہ یقول الانسان یومئذ این المفر ہ) پس جب ہم تیرے کرتوتوں کے ریکارڈ کو پڑھیں گے تب اس کی خواندگی کی پیروی کر۔ آج انسان ہمارے احکام کی پیروی کرنا نہیں چاہتا تو نہ کرے لیکن کل جب ہم اس کے اعمالنامے کے مطابق حکم سزا سنائیں گے تو سرتابی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ اے غافل انسان، آج ہمارے حکم کی پیروی اختیار کرنے میں تیرے لئے فلاح وسعادت ہے۔ اس دن ہمارے حکم کی پیروی تو محض اپنے برے انجام سے دوچار ہونے کے مترادف ہوگی۔ پس اے قیامت کی تکذیب کرنے والے، افسوس ہے تجھ پر۔ (اولی لک فاولی ہ ثم اولی لک فاولی)[۵]

عام اہل علم کا خیال ہے کہ لاتحرک بہ لسانک میں خطاب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ اور سارے ضمائر جمعہ، قرآنہ، وغیرہ قرآن کی طرف راجع ہیں۔ اس غلط فہمی کی ایک بڑی وجہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منسوب ایک قول ہے جو سعید بن جبیرؓ سے منقول ہوا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے منسوب قول پر عمل کرنے سے مذکورہ آیات کا سیاق وسباق سے کوئی ربط باقی نہیں رہتا۔ ان کو جملہ معترضہ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ جملہ معترضہ کلام میں جس جگہ آتا ہے ایسا نہیں ہے کہ اس سے اس کا کسی نوع کا بھی تعلق نہ ہو۔ جملہ معترضہ کے ذریعہ سے کبھی موقع کی کسی بات کی وضاحت مطلوب ہوتی ہے، کبھی کسی شبہ کا ازالہ مقصود ہوتا ہے۔ اور کبھی پیش نظر موقع کی مناسبت سے کوئی مفید ومماثل بات پیش کرنی ہوتی ہے۔ نہ یہ کہ کوئی ایسی بات کہی جائے جس کا سرے سے کوئی موقع ومحل نہ ہو۔

یہاں لاتحرک بہ لسانک سے پہلے یا بعد کی آیات میں کہیں قرآن کا کوئی ذکر نہیں آیا ہے کہ اس کی طرف ضمائر کو راجع ماننا ہمارے لئے درست ہو۔ قرآن کی طرف ضمائر کو راجع ماننے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لئے کوئی نہ کوئی قرینہ درکار ہے۔ خواہ وہ قرینہ لفظی ہو یا معنوی۔ یہاں سرے سے اس کا نہ کوئی لفظی قرینہ پایا جاتا ہے اور نہ معنوی قرینہ پایا جاتا ہے۔ رہا حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منسوب قول تو مختلف اسباب سے اسے قبول کرنا مشکل ہے۔

جملہ معترضہ

قرآن میں مختلف مقامات پر جملہ معترضہ آیا ہے۔ اور بعض مقامات پر تو یہ حصہ نہایت طویل ہو گیا ہے۔ اگر قاری یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ فلاں آیت یا آیات جملہ معترضہ کی حیثیت رکھتی ہیں تو لازماً اسے کلام میں سخت بے ربطی محسوس ہو گی، جس کی اطمینان بخش توجیہ وہ نہ کر سکے گا۔ مثلاً سورۃ التطفیف میں ہے: كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ (۷-۹) یہاں آیت وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ جملہ معترضہ کی حیثیت سے آئی ہے، لیکن بالعموم لوگوں نے كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ کو وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ کا جواب سمجھ لیا۔ یعنی تم کیا جانو کہ سجین کیا ہے؟ وہ کتاب مرقوم (لکھی ہوئی کتاب) ہے۔ اب سوچئے کہاں سجین اور لکھی ہوئی کتاب۔ دونوں میں کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ یہ اشکال درحقیقت جملہ معترضہ کو جملہ معترضہ نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ علامہ فراہیؒ نے وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ کو جملہ معترضہ مانا ہے اور اسی طرح وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ (التطفیف: ۱۸) کو بھی وہ جملہ معترضہ قرار دیتے ہیں۔

حذف

قرآن میں فصاحت و بلاغت کے تقاضوں کے تحت محذوفات بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ایسے مواقع پر مطلوب یہ ہوتا ہے کہ قاری یا سامع کا بیدار ذہن محذوف حصے کو خود پُر کر لے۔ حذف کے اسلوب سے کلام میں خوبی و دل کشی اور اس کی قوت و توانائی میں غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے۔ قاری کو کلام میں اپنی قوت تخیل سے کام لینے کا پورا موقع ملتا ہے۔ پھر اس اسلوب کے ذریعہ کبھی ایسے لطیف خیال و تصور کی طرف ذہن کو موڑنا مطلوب ہوتا ہے جس کے متحمل الفاظ نہیں ہوتے۔ مثلاً قرآن میں ہے:

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ	آخر جب دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور اس نے کنپٹی کے بل اس کو لٹایا اور ہم نے اسے پکارا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الرُّؤْيَا (الصّٰفّٰت ۱۰۳-۱۰۵) اے ابراہیم، تو نے خواب کو سچ کر دکھایا۔

یہاں جب دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس نے اس کو کنپٹی کے بل لٹایا کے بعد ایک جملہ حذف ہے۔ یہاں واو اس کا قرینہ موجود ہے۔ لَمَّا (جب) کا جواب دیے بغیر بات دوسری شروع کر دی گئی۔ یہ حذف بتقاضائے بلاغت ہے۔ باپ (حضرت ابراہیمؑ) انتہائی محبت کے باوجود اپنے لختِ جگر کو خدا کا حکم، پا کر ذبح کرنے کو تیار ہے۔ بیٹا بھی فیصلۂ خداوندی کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔ چھری گردن پر چلنے ہی والی ہے۔ تصور کریں، کیا عالم رہا ہوگا! الفاظ میں اس کا اظہار ممکن نہیں۔ اس اسلوب میں کیفیات، جذبات، اور خیالات کے اتنے پہلو سمیٹ لیے گئے ہیں کہ تفصیل کی صورت میں یہ ممکن نہ ہو سکتا۔ اس کے علاوہ محذوفات کی وجہ سے ہمارے ذہن و تخیل کو یہ موقع حاصل ہوتا ہے کہ وہ قرآن کے غیر ملفوظ حصے یا غیر مسموع آواز کی جگہ لے سکے اور یہ بڑے شرف کی بات ہے۔

عَوْدٌ عَلَی الْبَدْءِ

قرآن میں مختلف سورتوں میں عَوْدٌ عَلَی الْبَدْءِ کا اسلوب اختیار فرمایا گیا ہے۔ اس اسلوبِ کلام کی خاص بات یہ ہے کلام جس چیز سے شروع ہوتا ہے اسی پر وہ ختم بھی ہوتا ہے۔ قرآن کی بعض سورتیں تو پوری کی پوری اسی اسلوب پر مبنی ہیں۔ اس اسلوب کے علم سے نظمِ قرآن کی بہت سی الجھنیں رفع ہو جاتی ہیں۔

صنعتِ احتباک

صنعتِ احتباک کا قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ اس صنعت سے باخبری کی وجہ سے بھی کلام میں خلا اور بے ربطی کا احساس ہوتا ہے۔ اس صنعت کے تحت کلام میں دو مقابل کی چیزوں کا ان کے احوال کے ساتھ اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ ایک چیز کا جو پہلو بیان کرتے ہیں اس کے تقابل کے پہلو کو دوسری چیز کے ذکر میں بیان نہیں کرتے۔ جیسے قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ لِتَسْکُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا — وہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا (یونس: ۶۷)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصل مضمون یوں ہے:

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ مُظْلِمًا لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَجَعَلَ لَكُمُ النَّهَارَ مُبْصِرًا لِتَعْمَلُوْا فِیْهِ	وہی ہے جس نے تمہارے لئے رات تاریک بنائی تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو۔ اور تمہارے لئے دن کو روشن بنایا تاکہ تم اس میں کام کرو۔

دن اور رات ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ دونوں کے ایک وصف اور اس کی حکمت کا ذکر کرنا مقصود ہے۔ لیکن طریقہ یہ اختیار کیا کہ رات کا وصف مظلمًا ذکر نہیں کیا بلکہ اس کی حکمت و مصلحت بیان فرمادی کہ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ (تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو) اور دن کے وصف کا ذکر کیا مگر اس کی حکمت و مصلحت کا ذکر ترک کر دیا۔ کیونکہ قاری بادنیٰ تامل خود اس کو سمجھ سکتا ہے۔

احتباک کے اسلوب کی طرف توجہ نہ ہونے کی وجہ سے کلام میں عدم مطابقت اور Incoordination اور بے ربطی کا گمان ہوتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات تو کلام کے اصل مدعا ہی کے سمجھنے سے ہم قاصر رہ جاتے ہیں۔ مثلاً قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۝ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا ۝ وَّیَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝ فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۝ وَّیَصْلٰى سَعِیْرًا ۝ (انشقاق: ۷ - ۱۲)	پس رہا وہ شخص جسے اس کا اعمالنامہ اس کے داہنے ہاتھ میں دیا گیا (جس کو اس نے زندگی میں ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھا) تو اس سے آسان حساب لیا جائیگا اور وہ (جنت میں) اپنے لوگوں کی طرف خوش خوش پلٹے گا۔ اور رہا وہ شخص جسے اس کا اعمالنامہ (اس کے بائیں ہاتھ میں) دیا گیا جو (دنیا میں) اس کے پس پشت ڈال رکھا گیا تھا تو (اس سے سخت حساب لیا جائے گا اور تب) وہ ہلاکت کو پکارے گا اور بھڑکتی آگ میں داخل ہو گا۔

یہاں حسین و بلیغ احتباک ہے۔ تقابل کے ساتھ اہل ایمان اور اہل کفر میں سے ہر ایک سے متعلق کچھ باتیں پیش کی گئی ہیں لیکن ان الفاظ میں سب کا ذکر نہیں کیا گیا، کچھ کو مقدر کر دیا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیونکہ قرینۂ تقابل سے مذکورہ باتوں کی روشنی میں غیر مذکور باتوں کا علم بادنیٰ تامل ہو جاتا ہے۔ اہلِ ایمان کو ان کا اعمالنامہ ان کے دائیں ہاتھ میں ملے گا، اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے خود بخود معلوم ہو جاتا ہے کہ کفار کو ان کے اعمالنامے ان کے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ کافر دنیا میں اپنے اعمالنامے کو پسِ پشت ڈالے رکھتا ہے۔ اُسے سرے سے اس کی کوئی فکر نہیں ہوتی کہ کبھی اس کے کرتوت اس کے سامنے لائے جائیں گے۔ اس کا ذکر کیا گیا۔ اس سے اپنے آپ معلوم ہو جاتا ہے کہ مومنین اپنے اعمالنامے کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہیں اور اس کی طرف سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ اس لئے اس کا ذکر الفاظ میں نہیں فرمایا گیا۔ مومن کا حساب یسیر (آسان) ہو گا۔ اس کا ذکر فرمایا گیا۔ اس سے خود بخود یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ کفار کا حساب عسیر (سخت) ہو گا۔ اس لئے یہاں اس کے ذکر کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

وَرَآءَ ظَهْرِهٖ فعل اُوْتِيَ کا مفعول فیہ نہیں ہے کہ اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ کفار کو پشت کے پیچھے سے ان کے اعمالنامے پکڑائے جائیں گے۔ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ درحقیقت كِتَابَهٗ کا حال ہے۔ مفعول فیہ ہونے کی صورت میں مِنْ وَّرَآءِ ظَهْرِهٖ فرمایا جاتا۔ کسی جہت سے کسی چیز کے لینے یا دینے کا ذکر کیا جائے تو مِنْ لانا ضروری ہے۔

ایک خاص اسلوب

قرآن کا ایک خاص اسلوب یہ بھی ہے کہ وہ بیشتر مقامات پر جہاں ایک یا چند الفاظ کے اعادہ کا موقع ہوتا ہے وہاں یہ اعادہ قرآن بالعموم الفاظ بدل کر کرتا ہے۔ اس سے سابق لفظ کی معنویت اور اس کی وسعت اور اس کے لوازم کو سمجھنا ہمارے لئے آسان ہو جاتا ہے۔

اور اس سے ہمارے علم میں مفید اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۝ (۱۷-۲۵)

جو تمہارے جی میں ہے اُسے تمہارا رب خوب جانتا ہے اگر تم صالح ہوئے تو یقیناً وہ بھی رجوع کرنے والوں کے لئے بڑا بخشنے والا ہے۔

عام کلام میں الفاظ کی ترتیب یا اُن کا اعادہ اس طرز پر نہیں ہوتا۔ ایسے موقع پر ارتباط منطقی کے تحت الفاظ کا اعادہ اس طرز پر کیا جاتا: خدا تمہارے باطن کے حال سے بخوبی واقف ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر تمہارا باطن درست ہوا تو یقیناً خدا ایسے لوگوں کے لئے بڑی بخشش والا ہے جن کی باطنی حالت درست ہو۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے یہاں ایک شخص کا ذکر تین بار کیا ہے لیکن اس کے لئے الفاظ مختلف استعمال کئے گئے، کیونکہ ایک ہی لفظ کی تکرار سے ہمارے علم میں کوئی اضافہ نہ ہوتا۔ قرآن نے یہاں الفاظ مختلف استعمال کر کے سلوک و تربیت کا ایک جامع نقشہ ایک مختصر سی آیت میں پیش کر دیا ہے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ زندگی کی درستی کا انحصار اصلاً اندرون کی درستی پر ہے۔ اندرون اگر درست ہے تو انسان لازماً صالح بن کر اٹھے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ایک چیز اور بھی درکار ہے اور وہ اوابیت کی صفت ہے۔ انسان کے لئے صرف اندرون کی درستی اور زندگی میں صالحیت کا پایا جانا کافی نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا میں راہ سے بے راہ کر دینے والی ترغیبات کی کمی نہیں ہے۔ شیطان ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا ہے، جس کی پوری کوشش یہ رہتی ہے کہ وہ انسان کو کسی نہ کسی طرح گمراہ کر کے دم لے۔ اس لئے ضروری ہے انسان اوابیت کی صفت سے بھی متصف ہو۔ یعنی وہ بار بار اپنے رب کی طرف اس طرح پلٹتا رہے جیسے کہیں اور اسے قرار نہیں آتا۔ انسان کی یہی صفت اسے حق پر قائم رکھ سکتی ہے۔ اور پھر یقیناً وہ خدا کا مقبول بندہ بن جاتا ہے۔

اس آیت میں ایک ہی شخص کو جو باطن کے لحاظ سے مزکّیٰ ہے، صالح اور پھر اواب سے موسوم فرمایا گیا۔ شخص ایک ہی ہے۔ اس کے باطن کو اگر ترفع اور بالیدگی حاصل ہے تو اسے صالح اور اواب بھی ہونا چاہیے۔ ایسا شخص برابر خدا کی طرف رجوع ہوتا رہے گا۔ باطن کی درخشانی اسے ایک حال پر ٹھہرے رہنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ وہ باطن ہی کیا جس کا اظہار نہ ہو اور یہ اظہار حسین اسالیب اختیار نہ کر سکے۔ جس میں اپنے خدا کے لئے کوئی لپک اور اضطراب نہ پایا جائے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں تبدیلیٔ الفاظ کی وجہ سے اعادہ میں بڑی معنویت پیدا ہو گئی ہے۔

اصول بلاغت اور قرآن کے اسالیب پر نظر ہو تو قرآنی نظم کلام کی راہ بڑی حد تک ہموار ہو جاتی ہے۔ پھر بھی کلام خداوندی میں اس طرح کا ربط ہمیں دکھائی نہیں دے سکتا جو عام کلام میں پایا جاتا ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ عام کلام میں جو نظم وارتباط پایا جاتا ہے وہ منطقی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور محض اکہرا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن کے نظام ارتباط و نظم کی شان ہی دیگر ہے۔ اس کو ذرا تفصیل سے سمجھنے کی ضرورت ہے

ارتباط حیَوی

کلام ہمیشہ الفاظ اور جملوں سے مرکب ہوتا ہے۔ کلام میں الفاظ اور جملوں کے مابین ربط و تعلق کا ہونا ضروری ہے۔ نظم و ربط اور مرافقت یا ائتلاف Association اعلیٰ تہذیب کی خصوصیت ہے اس کے برعکس بے ربطی اور انتشار درحقیقت وحشت کا مزاج ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ مہذب کلام میں نظم و ارتباط کی موجودگی ضروری ہے۔ ارتباط کو ہم اصولی طور پر دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں: منطقی ارتباط اور ارتباط حیَوی۔ انجیل کی ایک عبارت ہے:

"لیکن میں تم کو جانتا ہوں کہ تم میں خدا کی محبت نہیں۔ میں اپنے باپ کے نام سے آیا ہوں اور تم مجھے قبول نہیں کرتے۔ اگر کوئی اور اپنے ہی نام سے آئے تو اسے قبول کر لوگے۔ تم جو ایک دوسرے سے عزت چاہتے ہو اور وہ عزت جو خدائے واحد کی طرف سے ہوتی ہے نہیں چاہتے کیونکر ایمان لا سکتے ہو" (یوحنا ۵: ۴۲-۴۴)

عربی انجیل کے الفاظ یہ ہیں:

وَلٰكِنِّيْ قَدْ عَرَفْتُكُمْ اَنْ لَيْسَتْ لَكُمْ مَحَبَّةُ اللّٰهِ فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَنَا قَدْ اَتَيْتُ بِاِسْمِ اَبِيْ وَلَسْتُمْ تَقْبَلُوْنَنِيْ اِنْ اَتٰى اٰخَرُ بِاِسْمِ نَفْسِهٖ فَذٰلِكَ تَقْبَلُوْنَهٗ كَيْفَ تَقْدِرُوْنَ اَنْ تُؤْمِنُوْا وَاَنْتُمْ تَقْبَلُوْنَ مَجْدًا بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ وَالْمَجْدُ الَّذِيْ مِنَ الْاِلٰهِ الْوَاحِدِ لَسْتُمْ تَقْبَلُوْنَهٗ۔

اس عبارت کو غور سے پڑھیں تو صاف طور پر اس کے فقروں میں باہم ایک واضح ربط و تعلق پایا جاتا ہے جس سے کلام کا مفہوم و مدعا صاف طور پر سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس کے فقروں میں جو ارتباط قائم رکھا گیا ہے، وہ منطقی ارتباط کی ایک واضح مثال ہے۔ یہاں بات میں کوئی ایسی پیچیدگی اور وسعت نہیں پائی جاتی جس کو سمجھنے کے لئے کسی خاص غور و فکر اور تدبر کی ضرورت پیش آئے۔ حضرت مسیح شکایت کرتے ہیں کہ تمہارا دل خدا کی محبت سے یکسر خالی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں اُس کی جانب سے آیا ہوں اور اس کا پیغام پہنچا رہا ہوں لیکن تمہیں قبول نہیں۔ اِس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برخلاف کوئی دوسرا آئے جو خدا کا فرستادہ نہ ہو تو اسے قبول کر لوگے۔ تم اپنے جیسے انسانوں سے عزت کے خواستگار ہو۔ لیکن ایک عزت وہ ہے جو انسان کو خدائے واحد کی طرف سے ملتی ہے لیکن تمہیں اس عزت کی کوئی آرزو نہیں۔ ایسی صورت میں اس کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ تم ایمان لاؤ گے۔ تم جھوٹی اور ناپائیدار عزت پر قانع ہو تو پھر وہ کون سی طلب ہوگی جس کی وجہ سے تم کو ایمان لانے کی ضرورت کا احساس ہو سکے۔

انجیل کی مذکورہ عبارت کا ہر شخص بادنیٰ تامل یہی مفہوم لے گا جو میں نے بیان کیا ہے۔ اس سے بڑھ کر کسی اور معارف اور مطلب کی اس کے اندر گنجائش نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی یہ عبارت بامعنی ہے۔ اس میں اعلیٰ درجہ کا فکر و خیال ظاہر کیا گیا ہے۔ انجیل کی اس عبارت کے جملوں اور اس کے الفاظ کے مابین جس قسم کا ارتباط پایا جاتا ہے وہ ارتباط منطقی ہے۔ لیکن نظم و ارتباط کی ایک قسم اس کے سوا بھی ہے وہ ارتباطِ حیوی ہے۔ ارتباطِ حیوی کی اعلیٰ درجہ کی مثالیں قرآن مجید میں پائی جاتی ہیں۔ اب اگر ارتباط حیوی کی خصوصیات اور اس کے اثرات سے ہم ناواقف ہیں تو قرآن کی آیات و سور کے نظم کلام کی قدر و قیمت کا ہمیں صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اور قرآن کے نظم و ارتباط کے سلسلہ میں طویل تر بحثوں اور خامہ فرسائیوں کے باوجود ہمارے دل کو وہ اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا جو اسے مطلوب ہے۔

بالعموم لوگ کلام کے جس ارتباط سے واقف اور مانوس ہوتے ہیں وہ ارتباط منطقی ہوتا ہے۔ وہ قرآن میں بھی اسی قسم کا ارتباط تلاش کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قرآن منطقی ارتباط سے عاری ہے۔ بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں ارتباط منطقی کے ساتھ ساتھ ارتباط حیوی کی کرشمہ سازیاں بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ ارتباط کی اس نوع سے ہمارے ذہن مانوس و آشنا نہیں ہوتے جس کی وجہ سے ہم قرآن کے اس ارتباط منطقی کو ذہن کی گرفت میں لانے سے قاصر رہ جاتے ہیں جو اس میں موجود ہوتا ہے۔ قرآن کا منطقی ارتباط اس کے ارتباطِ حیوی کا ساتھ دیتا ہے اور اس کے ساتھ مسلسل اپنی موافقت قائم رکھتا ہے۔

منطقی ربط میں جیسا کہ عرض کیا گیا فقروں اور الفاظ کا باہمی تعلق اور اس کی بنیاد بالکل واضح ہوتی ہے۔ چونکہ یہ ربط و تعلق عام نطق و کلام کے مطابق ہوتا ہے اس لئے اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سمجھنے میں ہمیں ذرا بھی دشواری نہیں ہوتی۔ انجیل کی مذکورہ عبارت کا جو مفہوم ہم نے بیان کیا ہے اس کا وہی مفہوم ہزار سال بعد بھی لیا جائے گا۔ اس میں کسی قسم کے اضافہ کی گنجائش نہیں پائی جاتی۔ عام کلام میں شاذ و نادر ہی ایسی عبارت ملتی ہے جس میں معانی و مفاہیم کی کوئی وسیع دنیا آباد ہو۔

ارتباطِ منطقی اور ارتباط حیوی کے فرق کو ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ آپ اپنے کمرے میں میز پر پتھر کا ایک ٹکڑا رکھ کر باہر چلے جاتے ہیں۔ آپ کو پورا یقین ہوتا ہے کہ واپسی پر پتھر وہیں ملے گا جہاں آپ نے اسے رکھا ہے۔ لیکن کسی بچے کے بارے میں آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ واپسی پر وہ گھر میں اسی جگہ ملے گا جہاں باہر نکلتے وقت آپ نے اسے چھوڑا تھا۔ بچہ میں حیات ہے۔ حیات میں امکان کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ حیات عبارت ہی ہے حرکت اور جلووں کی بوقلمونی سے۔

ارتباط حیوی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ایک حیاتی ارتباط Living Connectedness کا نام ہے، اس ارتباط سے حیات کی خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں۔ اسی حیاتیاتی اوصاف کی بنا پر روایت میں قرآن کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ "اس کے عجائب ختم ہونے کے نہیں اور بار بار دہرانے سے وہ پرانا نہ ہوگا"۔ ولا یخلق علی کثرۃ الرد ولا تنقضی عجائبہ۔[۳]

آپ کے ہاتھوں کا آپ کے باقی جسم سے جو تعلق ہے وہ تعلق اصلاً حیاتی ہے۔ اس تعلق میں حیات کے اوصاف پائے جاتے ہیں، یہ تعلق کوئی محض منطقی قسم کا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کے سونے اور آرام کرنے کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے وثوق سے آپ یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ وہ شخص اگر سو رہا ہے تو اس کا ہاتھ کس وضع پر ہوگا۔ اس کا ہاتھ اس کے سر کے نیچے ہوگا یا اپنا ہاتھ وہ اپنے دائیں یا بائیں پہلو پر ڈال کر سو رہا ہوگا۔ اس لئے کہ یہاں یہ سب کچھ ممکن ہو سکتا ہے۔

حیوی خصوصیات واوصاف کئی ہیں۔ جہاں حیات کی کارفرمائی ہوگی وہاں تازگی، نشاط انگیزی، لطافت، حسن و زیبائی، دلکشی اور رونق وغیرہ سبھی مطلوب اوصاف پائے جائیں گے۔ حیات کے ساتھ یہ ساری خوبیاں فطری طور پر پیدا ہو جاتی ہیں۔ حیات چیزوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو ترتیب دینا بھی جانتی ہے۔ پھر اس کی ترکیب ہی میں نہیں، ترتیب میں بھی حسن ہوگا۔ حیات کسی کو جسم عطا کرتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ سر، آنکھ، ہاتھ وغیرہ اعضا میں سے ہر ایک کو جسم کے اسی حصے میں جگہ ملتی ہے جو اس کے لئے مناسب اور موزوں ہوتا ہے۔

ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ قرآن کے الفاظ اور اس کی آیات میں باہم حیوی ارتباط پایا جاتا ہے۔ اس لئے اس ارتباط میں وہ ساری خوبیاں جمع ہو گئی ہیں جو حیات کی خصوصیات ہیں۔ حیات کا ایک خاص وصف فعّالیت ہے۔ اس کی دنیا محدود قسم کی نہیں ہوتی۔ اس کے اندر بے انتہا امکانات ہوتے ہیں۔ ارتباطِ حیوی کی کارفرمائی کے سبب سے قرآنی آیات اور ان کے اجزاء CLAUSE باہم صرف کسی ایک پہلو کے اعتبار سے مربوط دکھائی نہیں دیتے بلکہ ان کے باہمی ربط و تعلق میں گوناگوں پہلو پیدا ہو گئے، یہی وجہ ہے کہ غور و فکر کرنے والا شخص حیران ہوتا ہے کہ وہ کس پہلو کو اختیار کرے اور کس پہلو کو نظر انداز ELIMINATE کرے۔ حیوی خصوصیات ہی کی کرشمہ سازی ہے کہ قرآن کے صوت و آہنگ میں کہیں بھی ناہمواری اور کھردرا پن نہیں پایا جاتا۔ پھر کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ قرآن کے صوت و آہنگ میں تو کسی قسم کی ناہمواری نہ ہو لیکن اس کے معانی و مطالب کا دامن معنوی حسن و آہنگ Harmony سے خالی ہو۔

قرآن کی آیات اور سورتوں کا نزول جس پس منظر میں ہوا ہے قرآن اکثر اس سے مطلق تعرض نہیں کرتا۔ پس منظر کو حذف کر دینے کی وجہ سے قرآن کی آیتوں اور سورتوں میں بالعموم لوگوں کو بے ربطی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن میں ارتباطِ حیوی کے پیدا ہونے میں اس حذف کا بڑا دخل ہے۔ اگر شانِ نزول کو قرآن اپنے اندر شامل کر کے گفتگو کرتا تو اس میں حیوت کے وہ خصائص بھی نہ ہوتے جو اس وقت اس میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں قرآن میں اگر منطقی اور عضویاتی ORGANIC تقاضوں کی رعایت اور شانِ نزول کی شمولیت کو جگہ دی جاتی تو قرآن میں پائے جانے والے حیوی ارتباط کی کرشمہ سازی محدود ہو کر رہ جاتی۔ قرآن میں پائے جانے والے حیوی ارتباط نے اس کو منطقی محدودیتوں سے نکال کر اس میں بے پناہ، کثیر الجہات معنوی تنوع پذیری اور جدت آفرینی کی گنجائش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیدا کر دی ہے۔ جس کا اندازہ بادنیٰ تامل ہر صاحبِ نظر کر سکتا ہے۔

قرآن کے ارتباطِ حیوی کو ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ قرآن میں ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۨ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۙ

(الملک: ۱-۲)

بڑی ہی عظیم و با فیض ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ساری بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جس نے موت وحیات کا نظام لکھا تاکہ تمہیں آزما کر دیکھے کہ تم میں عمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے اور وہ زبردست، بڑا بخشنے والا ہے۔

ان آیتوں کا ظاہر اور عام مفہوم تو یہی ہے کہ خدا کی ذات بڑی عظمتوں کی حامل اور فیض بخش ہے۔ بادشاہی اسی کی ہے اور اس کی قدرت میں کسی قسم کا ضعف نہیں پایا جاتا۔ اسی نے موت و حیات کا نظام قائم کیا۔ اور اس سے مقصود انسانوں کی اس بات میں آزمائش ہے کہ ان میں باعتبار عمل کون بہتر ثابت ہوتا ہے۔ اور وہ زبردست بھی ہے اور اسی کے ساتھ بہت مغفرت فرمانے والا بھی۔ لیکن ان آیتوں میں جو باتیں فرمائی گئی ہیں ان کا باہمی ربط و تعلق اس طرح واضح نہیں ہے جس طرح یہ عام کلام میں واضح اور نمایاں ہوتا ہے لیکن اگر ہم تدبر سے کام لیں تو ربط و تعلق کے گوناگوں پہلو ہمارے سامنے کھلتے جائیں گے۔

دیکھئے پہلے اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایک اہم بنیادی بات یہ بتائی جا رہی ہے کہ وہ عظیم ذات ہے، فیض بخشی اس کی ذاتی صفت ہے۔ کائناتِ ہست و بود میں اس کا حکم جاری ہے۔ اس لئے کسی قسم کے شرک کی قطعاً یہاں کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ چونکہ وہ قادرِ مطلق ہے اس لئے اس کی عظمت اور فیض رسانی میں کسی قسم کی کمی کا ہم تصور نہیں کر سکتے۔ اس کی فیض رسانیاں اور عظمتیں صرف آفاق تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان کا سلسلہ انسانی دنیا تک دراز ہے۔ یہ موت و حیات کا نظام اسی کا قائم کیا ہوا ہے۔ یہ کوئی بے معنی اور بے مقصد نظام نہیں ہے۔ اس سے مقصود انسانوں کی اس بات میں آزمائش ہے کہ ان میں کون بہترین شخص ثابت ہوتا ہے۔ انسان کے بہتر ہونے کا معیار دولت و ثروت کی فراوانی یا اسی طرح کی دوسری چیزیں نہیں ہیں جیسا کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دنیا کے بھٹکے ہوئے لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ انسان کے بہتر ہونے کا معیار حسنِ عمل اور حسن کردار ہے اس لئے حسنِ عمل اور حسنِ کردار ہی کو انسان کا ذاتی وصف کہا جا سکتا ہے۔ اور یہی اس کے بہتر ہونے کا معیار قرار پا سکتا ہے۔ پھر انسان کو اگر حیات حاصل نہ ہو تو اس سے کسی عمل کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ عمل کے لئے زندگی درکار ہے لیکن یہاں زندگی ہی سے نہیں، موت سے بھی سابقہ پیش آتا ہے۔ جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ موجودہ زندگی اپنا مقصود آپ نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر یہاں موت نہ آتی۔ اس لئے لازمی طور پر اس حیات سے کچھ اور ہے اور وہ کسی فرض یا کام کی انجام دہی ہی ہو سکتی ہے۔ اور اسی میں انسانی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ عقل عام کے نزدیک بھی انسان کے لئے باعثِ صد افتخار و شرف اس کا اونچا کردار ہی ہوتا ہے۔ خدا زبردست ہے۔ کوئی انسان اگر خدا کے منصوبہ کے خلاف روش اختیار کرتا ہے تو وہ اس کی گرفت سے بچ نہیں رہ سکتا۔ لیکن انسان اگر مقصدِ حیات کو سمجھتا اور اس کے حصول کے لئے اعمال نیک اختیار کرتا ہے تو خدا کی نوازشیں اور کرم فرمائیاں لازماً اسے اپنے دامن میں لے لیں گے۔

ایک اور پہلو سے محولہ آیتوں پر غور کریں جس کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ ڈور نہ ہو اسے باعظمت اور بافیض قرار دینا بے معنی سی بات ہوگی۔ خدا اگر عظیم اور بافیض ہے تو یہ اس بات کا متقاضی ہے کہ ملک اور بادشاہی پر اسی کا قبضہ ہو اور اُس میں جس طرح کا تصرف اس کے پیشِ نظر ہو اس میں اسے کسی قسم کی ناکامی نہ ہو۔ خدا کو ہر چیز پر پوری قوت حاصل ہے۔ اس بے نیاز نے ہم انسانوں سے معاملہ روا رکھا یہ اس کا محض فضل و کرم ہے۔ اس نے دو چیزیں ہمارے سامنے رکھ دی ہیں۔ ایک موت اور دوسری حیات۔ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون حیات کا طالب ہے اور کون موت کا پرستار ہے۔ حیات بذاتِ خود اس کے لئے ایک قوی محرک ہے کہ انسان حیات ہی کو ترجیح دے۔ رونق، عزت اور ہر قسم کی سرفرازی کا تعلق حیات سے ہے۔ موت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ لیکن دنیا میں موت ہر ایک کی تقدیر ہے۔ زمین پر رہنے والے ہر شخص کے لئے فنا مقدر ہے: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (الرحمٰن: ۲۶) حقیقی اور معتبر حیات دنیا نہیں آخرت ہے:

وَاِنَّ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْ[illegible] اور [illegible] آخرت [illegible] تو زندگی تو وہی ہے، کاش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یَعْلَمُوْنَ ٥ (عنکبوت: ۶۴) وہ جانتے ہوتے۔

دیکھنا یہ ہے کہ کس کی نظر دنیا پر ٹک کر رہ جاتی ہے اور کس کے پیشِ نظر آخرت کی حقیقی زندگی ہوتی ہے۔ دنیائے فانی سے سابقہ پہلے پیش آتا ہے اس لئے موت کا ذکر پہلے کیا گیا۔ آخرت کا مرحلہ بعد کا مرحلہ ہے اس لئے زندگی کا ذکر بعد میں فرمایا گیا، لیکن آخرت طلبی صرف آرزوؤں کا نام نہیں۔ آخرت کی پاکیزہ اور بہترین زندگی ان ہی کا حصہ ہے جو خود بہتر اور پاکباز ہوں۔ عقلِ عام بھی اسی کی توثیق کرتی ہے۔ اس لئے آخرت کے طالبوں کو نیک اعمال کے ذریعہ سے آخرت طلب کرنی ہوگی۔ مذکورہ آیتوں میں طلب و آرزو کا ذکر نہ کر کے یہ طلب و آرزو جس حسنِ عمل کی متقاضی ہے اس کا ذکر فرمایا گیا۔ اور آخر میں فرمایا کہ خدا عزیز بھی ہے اور وہ غفور بھی ہے۔ تاکہ انسان کو یہ خدشہ لاحق نہ ہو کہ کہیں یہ سب محض وعدے ہی نہ ہوں اور آگے کچھ ہونے والا نہ ہو۔ وہ عزیز ہے۔ اس میں کوئی ضعف اور کمزوری نہیں کہ وہ انسانوں کو یوں ہی چھوڑ دے نہ نیکوں کو اپنی نیکیوں کا صلہ مل سکے اور نہ نافرمانوں کو اپنے کرتوتوں کی کوئی سزا مل سکے۔ غفور یعنی اپنی رحمتوں سے اپنے وفاشعار بندوں کو ڈھک لینے کی اس کی صفت کوئی بے جان اور عارضی صفت نہیں ہے۔ اس کی یہ رحمت لازماً ظہور میں آئے گی جس طرح یہ دنیا اس کے فضل و کرم سے ظہور میں آئی ہے۔ جس کا مشاہدہ ہمہ آن ہو رہا ہے۔

مذکورہ آیتوں میں فکر کرنے سے یہ ساری باتیں خود بخود انتہائی مربوط ڈھنگ سے ہم پر منکشف ہوتی ہیں۔ یہ کرشمہ درحقیقت قرآن کے خصوصی نظمِ کلام اور ارتباطِ حیوی کا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات پیشِ نظر رکھنے کی ہے کہ آیاتِ قرآنی کے جو بھی معانی و مطالب منکشف ہوتے جائیں گے اُن سے آیات کے ابتدائی اور عام مفہوم کی تردید ہرگز نہیں ہوگی۔ بلکہ عربیت اور قرآن کے معیارِ فکر سے ہم آہنگ جتنے معانی و مفاہیم بھی ہم پر کھلیں گے وہ باہم متضاد و متصادم نہیں ہو سکتے۔ ان میں باہم موافقت کا رنگ ہمیشہ باقی رہے گا۔ اور آیاتِ قرآنی ان سبھی معانی و معارف کی جامع تسلیم کی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جوامع الکلام عطا فرمایا تو آخر خود اس کا اپنا کلام حیرت انگیز جامعیت کا حامل کیوں نہ ہوگا۔ علامہ فراہیؒ نے بہت صحیح فرمایا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"قرآن کے بعض پہلو ظاہر ہیں۔ ان سے جب ہم رہنمائی حاصل کرتے ہیں تو اس باطن سے آگاہ ہوتے ہیں جو اس ظاہر کے پیچھے چھپا ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ تدبر کرتے وقت ہم نہ کسی کلمہ کو اس کی جگہ سے ہٹاتے ہیں اور نہ قرآن کے معانی ظاہر کے علاوہ کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ایک کے بعد دوسری نئی حقیقت روشنی میں آجاتی ہے۔۔۔۔۔ (قرآن میں) تدبر کرنے والا برابر نئے حقائق سے آگاہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ نئے حقائق قرآن کے ظاہر کے منافی نہیں ہوتے بلکہ علم میں اضافہ ہوتے ہیں"[۴۴]

علامہ فراہی کے نزدیک نظم کلام، کلام کا ایک حصہ ہوتا ہے جس کی بدولت بہت سے ایسے حقائق کا انکشاف ممکن ہوتا ہے جو بتقاضائے حکمت واضح الفاظ میں بیان کئے گئے نہیں ہوتے۔ یعنی ان کے اظہار میں الفاظ کو واسطہ نہیں بنایا گیا ہوتا۔ نظم کلام کی طرف سے بے پروائی اختیار کرنے سے خود کلام کے مفہوم و معانی کا ایک بڑا حصہ غائب ہو جاتا ہے۔ علامہ فراہی کے نزدیک ترکیب میں ایک زائد حقیقت بھی ہوا کرتی ہے جو کسی چیز کے متفرق اجزا میں الگ الگ نہیں پائی جاتی پھر وہ امام رازیؒ کے اس قول کی توثیق و تصویب فرماتے ہیں کہ "قرآنی حکمت کا بڑا حصہ ترتیب و نظم کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے"[۴۵]

نظم کلام ہی ہے جو کسی سورہ کو ایک کل کی شکل دیتا ہے۔ اور اسی نظم کے ذریعے سے ہمیں سورتوں کے باہمی ربط و تعلق کا علم حاصل ہوتا ہے۔ قرآن کے نظم کلام کو سمجھنے کے لئے تدبر و تفکر ضروری ہے۔ تدبر کی ضرورت عام انسانی کلام میں پیش نہیں آتی اس لئے کہ یہ کلام بالعموم اپنے مفہوم و مدعا اور نظم کے لحاظ سے اتنا واضح ہوتا ہے کہ اُسے جاننے کے لئے صرف اس کا پڑھ لینا ہی کافی ہوتا ہے۔ لیکن کسی ایسے کلام میں جامعیت اور مفاہیم و معارف کے وہ امکانات نہیں ہوتے جو قرآن میں پائے جاتے ہیں۔

جس ارتباط حیوی کا میں نے ذکر کیا ہے وہ بالعموم پورے قرآن کی خصوصیت ہے قرآن نے اپنے حِکَم اور معارف کا بڑا حصہ اپنے نظم و ترتیب میں پنہاں رکھا ہے۔ اسی لئے وہ فکر و تدبر پر خاص طور سے زور دیتا ہے۔ قرآن کے نظم و ارتباط کی خاص اسلوب نے اس میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حیات کی بھی خصوصیات پیدا کر دی ہیں۔ اس چیز نے قرآن میں امکانات کی ایسی وسیع اور بہار آفریں دنیا بسادی ہے کہ اس پر کبھی بھی فرسودگی کی گرد نہیں پڑ سکتی اور نہ وہ کبھی بے مزہ ہو سکتا ہے۔

حواشی

۱؎ دیکھیں التفسیر البیضاوی

۲؎ ترمذی: ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل القرآن

۳؎ ترمذی: ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل القرآن

۴؎ خالد مسعود: قرآن میں تدبر و تفکر کا مقام (افاداتِ فراہی)، تدبر، شمارہ ۴۵، جنوری ۱۹۹۴ء، ص ۲۴-۳۵۔

۵؎ حمید الدین فراہی، تفسیر نظام القرآن (ترجمہ امین احسن اصلاحی)، دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ۱۹۹۰ء ص ۲۱۔

مطبوعاتِ ادارہ علوم القرآن

• قرآنی مقالات
دائرہ حمیدیہ (مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر) کے ترجمان، الاصلاح، کے منتخب مقالات کا مجموعہ حواشی و حوالوں کے ساتھ جدید انداز میں اصول تفسیر نظم قرآن اور دوسرے اہم مباحث پر تحقیقاتی مضامین کا نادر مجموعہ
صفحات: ۳۲۰، قیمت عام ایڈیشن: =/۶۰، لائبریری ایڈیشن: =/۸۵

• حقیقتِ نماز
مولانا امین احسن اصلاحی
نماز کے موضوع پر مولانا امین احسن اصلاحی کی مختصر لیکن نہایت قیمتی اور اہم کتاب
صفحات: ۶۰، قیمت: =/۵ روپے

• کتابیاتِ فراہیؒ
ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی
مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کی مطبوعات (کتب و مضامین) کے بارے میں ببلوگرافی کے جدید اصول کے مطابق مفید معلومات
مولانا فراہی کی شخصیت، افکار و علمی خدمات پر مطبوعہ مواد کے مکمل حوالے
ان کی نگارشات پر اہل علم کے تبصروں و تقاریظ کی نشاندہی
تینوں کتابیں معیاری کتابت اور آفسیٹ کی عمدہ طباعت سے مزین
اداروں، کتب خانوں اور تاجروں کے لئے خصوصی رعایت

ملنے کے پتے
ادارہ علوم القرآن پوسٹ بکس ۹۹ سرسید نگر علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲
مرکزی مکتبہ اسلامی ۱۳۵۳ چتلی قبر دہلی ۱۱۰۰۰۶

© rasailojaraid.com